مقامِ محمدیؐ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

برادران عزیز!

آپ کو معلوم ہے کہ میری زندگی کا مشن پیامِ خداوندی کو عام کرنا ہے۔ لیکن پیامِ خداوندی سمجھ میں نہیں آسکتا تاوقتیکہ مقامِ محمدیؐ نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ مقامِ محمدیؐ کہ جسے دوسرے لفظوں میں مقامِ نبوت کہا جائے گا۔ اور یہ ماورائے سرحد ادراک ہے یعنی وحی کا سرچشمہ۔ وہ مقام ہے جو انسانی عقل سے آگے ہے۔ اس لئے نہ تو مقامِ محمدیؐ کا تعین عقل کی رو سے کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی عقل کی رو سے اس کی کنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت تک پہنچا جا سکتا ہے یعنی یہ چیز عقل کے بس کی بات نہیں کہ یہ سمجھ سکے کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی ہے اور وہ نبی کو کس طرح ملتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جا سکتا ہے اسے خدا ہی سمجھا سکتا ہے جو وحی کا سرچشمہ ہے۔ اس مقام کے متعلق یوں تو قرآن کے مختلف گوشوں میں منتشر طور پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن سورہ النجم کی ابتدائی آیات میں اسے اس حسن اعجاز و ارتکاز سے بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے ان چھوٹے چھوٹے موتیوں میں بڑے بڑے اہم حقائق اس طرح سموئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ ان آیات کے متعلق میں نے اس سے پہلے (سلیم کے نام ایک خط میں) بھی لکھا تھا لیکن آج کی نشست میں انہیں ذرا تفصیل سے سامنے لایا جائے گا تاکہ قرآن کی روشنی میں مقامِ محمدیؐ ابھر کر سامنے آجائے۔

ان آیات تک پہنچنے سے پہلے' تمہیداً" کچھ عرض کرنا ضروری ہے یہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی تھی کہ ہمارے دور میں جس قوم (اہلِ مغرب) نے سائنس کی دنیا (کائناتی

علوم) میں اس قدر تحقیق و تفتیش کی اس کے سامنے مذہب (عیسائیت) وہ تھا جو علم کا دشمن اور عقل کا حریف تھا اور جن " حقائق کائنات " کو وہ وحی کی بناء پر پیش کرتا تھا وہ علمی تحقیقات کی روشنی میں ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اس لئے کہ جو وحی حضرت عیسیٰ کی طرف نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی اور جس تعلیم کو وحی (انجیل) کہا جاتا تھا وہ درحقیقت انسانوں کی خود ساختہ تعلیم تھی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یورپ کے یہ محققین نفس وحی ہی سے بدگمان ہو گئے۔ چنانچہ وہاں ایک فکری تحریک رونما ہوئی جس کی رو سے کہا یہ گیا کہ اس کائنات کے پیچھے تو یقیناً" ایک عظیم قوت ہے جو اسے اس حسن و خوبی سے چلا رہی ہے لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے' ان سے خدا اور اس کی راہ نمائی کا کوئی واسطہ نہیں۔ انسان کو اپنے معاملات عقل کی رو سے طے کرنے چاہیں۔ انسانی راہ نمائی کے لئے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں۔

Humanism

یہ تحریک (Humanism) کے نام سے متعارف ہے۔ اس تحریک کے علمبردار اسے محض ایک فکری تحریک تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار اور رائج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس تحریک کے ایک مشہور مفکر (Julian Huxley) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام (Religion without Revelation) یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد وحی پر نہیں ہے اس وقت اس کی فرصت نہیں اور یوں بھی اس سے میں اپنے موضوع سے دور ہٹ جاؤں گا ورنہ میں بتاتا کہ پچھلے جس قسم کے مذہب کی تلاش میں ہے وہ کس طرح قرآن کی وحی میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ نہ صرف اتنا جتنے کی اسے تلاش ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ اگر مغرب کے ان مفکرین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ خدا کی وحی جو اپنی اصلی شکل میں ہو وہ نہ علم کی دشمن ہوتی ہے' نہ عقل کی حریف' اور اس کے پیش کردہ حقائق علمی تحقیقات

کی روشنی میں مسلمات بن کر اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بہرحال ان منکرین کا مسلک یہ ہے کہ اس خدا کو تو مان لیا جائے جس کے قوانین خارجی کائنات میں کار فرما ہیں لیکن اس خدا سے انکار کیا جائے جس کے قوانین انسانی دنیا میں راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو ان کی یہ روش ایک قسم کا نفسیاتی تضاد (Psychological Contradiction) ہے جس کی رو سے وہ ایک طرف اس تسکین کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف ان پابندیوں سے بھی آزادی چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان کا لازمی جزو ہوتی ہیں۔

قرآن کا جواب

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآن نے ان Humanists کو للکار کر پکارا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس خود فریبی سے حاصل کیا ہے؟ محض کائناتی خدا کو ماننا اور انسانی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہ سمجھنا' خدا پر ایمان نہیں اس سے انکار ہے۔ لہٰذا اگر تمہیں اسے ماننا ہے تو پورے طور پر مانو **ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً** (2/208) اور اگر انکار کرنا ہے تو کھلے بندوں انکار کرو۔ یہ کیا کہ

منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن

آپ شاید کہیں کہ نزول قرآن کے زمانے میں Humanist کہاں تھے جو اس نے انہیں للکار کر ان کی اس غلط روش پر متنبہ کیا یہ تو ہمارے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانے میں (Humanists) نام رکھانے والا طبقہ نہیں تھا لیکن قرآن کا اعجاز ہی یہ ہے کہ وہ انسانی فکر کی ہر لغزش کو نمایاں (Point out) کرتا اور اس کی خامیوں کو واضح کر کے مثبت دلائل سے اس کی تردید کرتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس نے (Humanists) کی غلط **نگہی** کو کس انداز سے پیش کیا ہے اور کس طریق سے اس کی تردید کی ہے۔ سورہ المومنون میں ہے **قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ**

وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے؟ اور اس کا مالک و آقا کون ہے؟ اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہو کہ اس کا جواب تعصب اور جہالت سے نہ دیں' علم و بصیرت کی رو سے دیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس کے جواب میں یہ یقیناً" یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور وہی اس کا مالک اور آقا ہے سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ اس لئے کہ علم کی بارگاہ سے اس کے سوا کچھ اور جواب مل ہی نہیں سکتا۔ قرآن اس پر کہتا ہے کہ جب تمہاری عقل و دانش اور علم و بصیرت تمہیں اسی نتیجہ تک پہنچاتی ہے' تو پھر تم اصل حقیقت کو کیوں اپنے سامنے نہیں لاتے۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (23/84-85) اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ اس فضائے آسمانی میں تیرنے والے مختلف کروں میں جو کچھ ہے ان کی زندگی اور نشو و نما کس قانون کے مطابق ہو رہی ہے؟ نہیں اتنا ہی نہیں بلکہ یہ پوچھو کہ اس تمام کائنات کی نشو و نما (Development) کا مرکزی کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (23/86) اس کے جواب میں بھی یہ یہی کہیں گے کہ یہ سارا کنٹرول بھی خدا ہی کے لیے ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم اس کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟ (قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ) پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کائنات کی ہر شے پر اقتدار کس کا ہے۔ کس کا قانون ہے جس کے تابع یہ تمام اشیاء اس طرح مصروف سعی و عمل ہیں۔ وہ کون ہے جس کی طرف ہر شے اپنی حفاظت کے لئے پناہ ڈھونڈتی ہے اور جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کرے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ بتاؤ کہ تمہارا علم و بصیرت اس کا کیا جواب دیتا ہے قُلْ مَنْ' بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ

عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (23/88) وہ کہتا ہے کہ اس کے جواب میں بھی یہ یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)

خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی ان کار فرمائیوں کا اقرار کر لینے کے بعد' قرآن یہ پوچھتا ہے کہ تم بتاؤ کہ جب تمہارا علم و بصیرت تمہیں خود اس نتیجہ پر پہنچا رہا ہے کہ

(1) خارجی کائنات کی تمام اشیاء ایک غیر متبدل' مستقل' محکم قانون کے مطابق چل رہی ہیں اور

(2) یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں بلکہ خدائے کائنات کے متعین کردہ ہیں۔

تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے لئے بھی غیر متبدل قوانین حیات مستقل اقدار (Permanent Values) کی ضرورت ہے۔ اور یہ مستقل اقدار اس کی اپنی عقل و خرد کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ وہ کون سی بات ہے۔ جس سے تمہیں اس کا دھوکا لگتا ہے کہ انسان کائنات کے اس قاعدہ کلیہ سے مستثنٰی ہے (فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ) (23/89) کیا انسان بھی اسی کائنات کا ایک حصہ نہیں؟ انسان کو اگر باقی اشیائے کائنات سے امتیاز حاصل ہے تو صرف اس بات میں کہ یہ ان قوانین کی اطاعت بطیب خاطر (اپنی مرضی سے) کرتا ہے۔ اور دیگر اشیائے کائنات ان کے مطابق چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انسان کے معاملہ میں یہ صورت نہیں کہ اسے مستقل قوانین کی ضرورت ہی نہیں یا یہ ان قوانین کو خود وضع کر سکتا ہے۔ یہ قوانین خدا ہی کی طرف سے مل سکتے ہیں۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ ہم بھی انہیں اٹل اور غیر متبدل قوانین دے سکتے ہیں۔ اگر یہ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں اور خارجی دنیا میں خدا کی کبریائی پر ایمان لاتے ہیں تو یہ اپنے دعوے ایمان میں

جھوٹے ہیں۔ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (23/90)

خدا پر ایمان کے معنی

آپ نے غور کیا کہ قرآن کس طرح (Humanists) کے اس مسلک کی تردید کرتا ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کی خدائی کو تسلیم کر لیا جائے لیکن انسانی دنیا میں اس کی طرف سے راہ نمائی کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ وہ اسے خدا پر ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دنیا میں بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ قوانین کی ضرورت سمجھی جائے۔ اور اس کی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

اہل مغرب کا اعتراف

قرآن نے یہ کچھ چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ لیکن اب مغرب کے مفکرین (Humanists) کے مسلک کی بنیادی غلطی کو محسوس کر کے خود اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ خدا کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی راہ نمائی پر ایمان لایا جائے چنانچہ ہمارے دور کا ایک عظیم طبیعیاتی (Physicist) ایڈنگٹن اپنی کتاب Science and the Unseen World میں لکھتا ہے کہ اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔

اوسپنسکی (Ouspensky) اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اگر وحی کا تصور نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا اور مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے جو فکر انسانی کے احاطے سے باہر ہو۔ اس لئے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہو گا۔

(New Model of the Universe)

آپ نے غور کیا خود مغرب کے مفکرین کس طرح' خدا کے ساتھ وحی کی ضرورت کو لاینفک قرار دے رہے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک' مقام نبوت کے بغیر مذہب کا تصور ہی ممکن نہیں۔

کتاب کیسی ہو؟

اب یہ دیکھئے کہ قرآن نے مقام نبوت کو کن الفاظ میں سمجھایا ہے۔ لیکن یہاں پھر چند الفاظ تمہیداً" ضروری ہیں اسی ہیگنلے نے اگست 1952ء میں نیویارک میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ جس مذہب کی تلاش میں وہ ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے پیش ایسے انداز میں کیا جائے جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نفع اندوز ہو سکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پر معنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔ (نیو یارک ٹائمز 22/8/52) دیکھئے کہ قران کریم اس معیار پر بھی کس طرح پورا اترتا ہے۔ اسے بات یہ سمجھانی ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں ہر شے ایک غیر متبدل قانون کے تابع سرگرم عمل ہے اور وہ قانون اس کا اپنا وضع کردہ نہیں' اسی طرح انسان کے لئے بھی اسی قسم کے غیر متبدل قوانین کی ضرورت ہے۔ جو اسے وحی کی رو سے ملیں۔ قرآن کو یہ بات سمجھانا تھی اور (سب سے پہلے) سمجھانا تھی

قرآن کی اوّلین مخاطب قوم

اس قوم کو جو نہ کارگہ کائنات کے نظم و نسق سے واقف تھی نہ سائنٹفک تحقیقات سے آشنا۔ اس قوم کی علمی سطح کیا تھی اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ قوم آج سے چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے دور حاضرہ والے تاریک زمانہ (Dark Ages) کہتے ہیں۔ یعنی خود زمانے کے اعتبار سے وہ دور

تاریکی کا دور تھا۔ پھر اس تاریکی کے دور میں عرب کا ملک' اپنے ہم عصر ممالک میں' تہذیب و تمدن تو ایک طرف' علم و بصیرت میں بھی سب سے پیچھے تھا۔ اس خطہ میں ایسے لوگ بھی بہت کم تھے جو معمولی نوشت و خواند ہی سے واقف ہوں۔ یہ لوگ اونٹوں کے دودھ اور کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرتے تھے۔ یہ تھے اولین مخاطب جنہیں یہ سمجھانا تھا کہ تمہیں زندگی میں مستقل قوانین کی ضرورت ہے اور یہ قوانین وہاں سے ملیں گے جہاں سے خارجی کائنات کو قوانین فطرت ملے ہیں۔ ذرا دیکھئے کہ قرآن اس بلند اور دقیق حقیقت کو ان لوگوں کو کن الفاظ میں سمجھاتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس حقیقت کو جن الفاظ میں اس جاہل اور ناخواندہ قوم کو ازمنہ مظلمہ میں سمجھایا گیا تھا وہی الفاظ آج اس دور علم و تمدن میں بلند ترین مفکروں کے سامنے کس طرح انکشاف حقیقت کرتے ہیں؟

وہ بادیہ نشین قوم تھی۔ زندگی کا معمول یہ کہ ـــــ ہر صبح سفر' ہر شام سفر ـــــ بلکہ صبح تو گاہے گاہے۔ سفر اکثر و بیشتر شام ہی کو ہوتا۔ اس لئے کہ دن کے وقت ریگستان میں سخت گرمی ہوتی۔ اور ان کے کارواں اکثر راتوں کو سفر کرتے لیکن ان کا یہ سفر گرانڈ ٹرنک روڈ پر نہیں ہوتا تھا کہ پشاور سے چلئے اور آنکھیں بند کئے سیدھے کلکتہ پہنچ جایئے۔ ان کا سفر صحراؤں میں ہوتا جن میں نہ کہیں سڑکیں تھیں نہ نشانات راہ۔ اگر کبھی کسی نے کوئی نشانات متعین بھی کر لیے۔ (مثلاً" یہ کہ کوئی ٹیلہ ہے اور وہاں کچھ جھاڑیاں' تو صحرا میں چلنے والی ہوائیں اور ان سے اڑنے والی ریت دوسری شام تک ان نشانات کو بدل کر رکھ دیتی۔ جہاں کل ٹیلہ تھا وہاں آج گڑھا تھا جہاں گڑھا تھا وہاں ریت کا ڈھیر ہے۔ پھر' وہاں بستیاں اور آبادیاں بھی قریب قریب نہ تھی کہ مقامی لوگوں سے راستہ پوچھ لیا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ وہ ان حالات میں سفر کرتے تھے اور وہ بھی تاریک راتوں میں۔

ستاروں کی راہنمائی

ان سے کہا گیا کہ تم جو ان صحراؤں میں' اندھیری راتوں میں سفر کرتے ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تم راستے کی تلاش میں مارے مارے پھرو۔ یا راستہ پا لینے کے بعد پھر بھٹک جاؤ۔ تو ایسا کس طرح سے ہوتا ہے؟ وہ کون سے مستقل نشانات ہیں جن سے تم راہ نمائی حاصل کرتے ہو؟ ان کا جواب صاف اور سیدھا تھا کہ ہم تاریک راتوں میں ستاروں سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایسے سچے راہبر ہیں کہ راستہ دکھانے میں نہ کبھی غلطی کرتے ہیں نہ دھوکا دیتے ہیں۔ قرنہا قرن سے ہمارا یہ تجربہ ہے اور نسلاً" بعد نسل اس کی شہادت ملتی چلی آ رہی ہے۔ ان کی راہ پر نہ زمانے کا اختلاف اثر انداز ہوتا ہے نہ ملکوں کا بعد اور تفاوت یہ ہر زمانے اور ہر قوم کو یکساں راہ نمائی دیتے ہیں۔ ان کا شروع سے یہی انداز چلا آ رہا ہے۔ اور آج بھی ان کی یہی روش ہے۔

اس پر ان سے کہا گیا کہ ذرا سوچو کہ جس خدا کی طرف سے ستاروں کو یہ صلاحیت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اپنی راہ نمائی میں نہ غلطی کرتے اور نہ دھوکا دیتے ہیں اگر اسی خدا کی طرف سے تمہیں بھی راہ نمائی ملے تو کیا وہ راہ نمائی بھی ستاروں کی راہ نمائی کی طرح مستقل' غیر متبدل قابل اعتماد' سہو خطا سے مبرا اور فریب دہی کے امکان سے بلند و بالا ہو گی یا نہیں۔؟

والنجم اذاھویٰ

یہ ہے وہ مقام جہاں سے سورہ والنجم کی ابتداء ہوتی ہے۔ یعنی **وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى** ○ (53/1) طلوع ہونے والا ستارہ۔ جب وہ اپنا راستہ طے کرنے کے بعد غروب ہوتا ہے۔ اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ **مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى** ○ (53/2) تمہارا یہ رفیق سفر جو تمہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف لے

جانا چاہتا ہے' نہ تو راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی راستے پا جانے کے بعد بھٹک گیا ہے اس لیے کہ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ○ (53/3) یہ جو کچھ کہتا ہے اپنے تخیلات و تصورات سے نہیں کہتا۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ○ (53/4) یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو دی جاتی ہے۔

انسانی خیالات کی کیفیت

انسانی خیالات کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔

زماں زماں شکنند آں چہ می تراشد عقل

جو باتیں ہم بچپن میں کرتے ہیں' ذرا آگے بڑھ کر دیکھئے تو ان پر خود ہی بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ جوانی کے جن فیصلوں کو ہم عقل و تدبر اور دانش و بینش کا کمال سمجھتے ہیں' پانچ سات برس بعد' وہ چند نادانیوں سے زیادہ کچھ دکھائی نہیں دیتے اس کے بعد علم و تجربہ میں کچھ پختگی آنے لگتی ہے تو بڑھاپا آ جاتا ہے جس میں (قرآن کے الفاظ میں) عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت تو عمر کی مختلف منزلوں میں ہوتی ہے۔ ایک ہی منزل میں حالت یہ ہوتی ہے کہ صحت کے عالم میں خیالات اور کس قسم کے ہوتے ہیں' بیماری کے زمانے میں اور قسم کے۔ حالات مساعد ہوں تو زاویہ نگاہ اور قسم کا ہوتا ہے اور جب پریشانیاں گھیر لیں تو تمام نظریات و تصورات بدل جاتے ہیں۔ غصے کے عالم میں ہمارے خیالات اور قسم کے ہوتے ہیں' سکون کی حالت میں اور قسم کے۔ یہ حالت تو افراد کی ہے اگر قوموں کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جن باتوں کو کوئی قوم سو سال پہلے علم و دانش کی معراج سمجھتی تھی آج وہ خود ان پر ہنستی ہے۔

وحی کی خصوصیت

لہذا جو شخص اپنے خیالات سے کوئی بات کہے گا وہ اس کی طبعی کیفیات اور ذہنی اور قلبی میلانات سے متاثر اور اس کے زمانے کے احوال و ظروف سے متسم ہو گی اس لئے وہ کبھی مستقل اقدار (نہ بدلنے والے قوانین) کا تعین نہیں کر سکے گا۔ یہ چیز صرف اس سرچشمہ سے مل سکے گی جو زمان و مکان کے ہر قسم کے اثرات سے مبریٰ ہو اور قلبی و ذہنی عواطف و میلانات کی رنگینی سے معرا۔ اسے وحی کہتے ہیں۔

انہی حقائق کو قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے۔ ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق سورہ انعام میں ہے **وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** (6/98) اللہ وہ ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے ستاروں کو اس انداز سے بنایا کہ تم ان سے زمین اور سمندر کے سفر کی تاریکیوں میں راہ نمائی حاصل کر سکو۔ سورہ واقعہ میں کہا کہ **فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ** ○ (56/75) نہیں! بات یوں نہیں جیسے تم اپنے ذہن میں خیال کئے ہو۔ بات کچھ اور ہے اس کے لئے ستاروں کی گذر گاہوں (ان کے طلوع و غروب کے مواقع) کو شہادت میں پیش کرتا ہوں **وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ** ○ (56/76) اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گی کہ یہ شہادت کس طرح بنیادی اور رفیع الشان ہے۔ یہ شہادت کس امر کی ہے؟ اس امر کی کہ **إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ** ○ (56/76) یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کہ یہ قرآن نوع انسان کے لئے بڑا ہی نفع رساں اور عزت بخش ہے **فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ** ○ (56/77) اس کے حقائق غیر متبدل ہیں اور وہ خود بھی ایک محفوظ کتاب کے اندر ہے۔ اس لئے اس کے حروف و الفاظ میں بھی کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ حقائق کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ

الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ میں تبدیلی ہو جائے تو حقائق میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ الفاظ کا صحیح مفہوم بھی اسی صورت میں سمجھ آ سکتا ہے۔ جب ان الفاظ کو خالی الذہن ہو کر سمجھا جائے۔

قرآن سمجھنے کا طریقہ

اگر انسان پہلے سے اپنے ذہن میں کوئی خاص خیالات اور تصورات لے کر قرآن کی طرف آئے تو قرآنی حقائق اپنی اصلی اور بلا آمیزش شکل میں سامنے نہیں آ سکیں گے۔ اس لئے تطہیر فکر و نظر نہایت ضروری ہے لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (56/79) اس کے حقائق کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کا قلب و دماغ غیر قرآنی تصورات سے پاک ہو۔ جن کا ادراک بے رنگ ہو۔

پھر جس طرح ستاروں کی رہنمائی تمام اقوام عالم اور جملہ ممالک دنیا کے لئے یکساں ہے اسی طرح، قرآن کی راہنمائی بھی زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز اور تمام نوع انسانی کے لئے یکساں ہے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو پورے عالم انسانیت کا نشو و نما دینے والا ہے تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (56/80) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ (56/81) ذرا سوچو کہ تم اس قسم کے محکم، غیر متبدل، یقینی ستاروں کی طرح واضح اور روشن ضابطہ حیات کو جھٹلاتے ہو؟ اس سے ادھر ادھر پھسلنا چاہتے ہو۔ اس میں کمی بیشی کر کے، مداہنت اور مفاہمت (Compromise) کی راہیں تراشنے کی کوشش کرتے ہو؟ تم چاہتے ہو کہ اس میں تمہاری مرضی کے مطابق تھوڑا سا ردو بدل کر دیا جائے! بتاؤ کہ اگر ستارے، لوگوں کی خواہش کے مطابق اپنے راستے بدلنے لگ جائیں تو راستہ چلنے والوں کا کیا حشر ہو؟

اور ایسی روش تم اختیار کیوں کرتے ہو؟ محض اس لئے کہ تم نے مذہبی

پیشوائیت کو اپنے لئے ذریعہ معاش (روٹی کا آسرا) بنا رکھا ہے اور قرآنی مسلک اختیار کرنے سے وہ چیز چھن جاتی ہے؟ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (56/82) ذرا سوچو کہ کس قدر پست مقصد کی خاطر تم اتنی بلند حقیقت کو جھٹلاتے اور اس سے مداہنت اختیار کرتے ہو۔

اسی طرح' سورہ تکویر میں ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ میں یہ باتیں یونہی بیان نہیں کر رہا۔ اس حقیقت پر سارا نظام کائنات شاہد ہے اس پر شاہد ہیں۔ وہ ستارے جو دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں۔ اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ اور وہ تیز خرام ستارے جو اپنی اپنی منزل طے کر کے چھپ جاتے ہیں وَ الَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ اور رات جو خاموشی سے آتی ہے اور خاموشی سے چلی جاتی ہے وَ الصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (81/15-18) اور صبح جب وہ حیات نو کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہر کائنات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ جو ہماری وحی کی بات تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغامبر ہے۔ اور نہایت معزز پیغامبر ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (81/19-20) اسے اس خدا کی طرف سے بڑی قوتیں عطا ہوئی ہیں جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کا مالک ہے۔

ماہرین فلکیات کا اعتراف

بہرحال یہ ہے وہ انداز جس سے قرآن نے اس صحرا نشین قوم کو اتنی بلند اور ایسی لطیف حقیقت سے آگاہ کیا' اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ ستاروں کی انہی گذرگاہوں سے دور حاضر کے بلند پایہ سائنسدان کس طرح ان حقائق تک پہنچے ہیں تو (زیادہ نہیں تو کم از کم) سر جیمز جینس کی مشہور کتاب (The Starry Way of Heavens) یا (Mysterios Uninverse) کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ عصر حاضر کا یہ سب سے بڑا ماہر افلاکیات' اس محیرالعقول کارگہ سماوی کے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد' خدا کے بلند و

بالا قانون کی عظمت و جلال کے سامنے کس طرح سجدہ ریز ہوتا ہے۔ وہ ان اجرام فلکی کی نقل و حرکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر علی وجہ البصیرت پکار اٹھتا ہے کہ قانون خداوندی کے محکم اور غیر متبدل ہونے پر ستاروں کی شہادت فی الواقعہ ایک عظیم شہادت ہے وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ

ہمارے معاشرے کی حالت

اب برادران! آگے بڑھئے ہمارے ہاں معاشرہ کی جو حالت ہو رہی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ لوگوں کے دلوں میں قانون کا احترام بہت کم رہ گیا ہے۔ قانون کی کتابوں کو دیکھئے تو وہ اعلیٰ درجہ کے قوانین سے بھری پڑی ہیں لیکن افراد معاشرہ کو دیکھئے تو قانون پر عمل بہت کم ہو رہا ہے۔ چوری نہ کرو' جھوٹ نہ بولو' کسی کو فریب نہ دو' کسی سے " چار سو بیس " نہ کرو' بلیک مارکیٹ سے مجتنب رہو' وغیرہ وغیرہ تمام قوانین اور ہدایات موجود ہیں لیکن ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ ان پر عمل نہیں ہوتا حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو شخص دیانت دار صداقت پسند رہنا چاہے اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ اس صورت حال کا تذکرہ کسی ذمہ وار اہل حل و عقد سے کیجئے وہ فوراً" کہہ دے گا کہ کیا کیا جائے؟ قانون تو موجود ہے لیکن اس کے نافذ کرنے کی مشینری بہت کمزور اور ناقص ہو چکی ہے۔ اس لئے معاشرہ میں ہر طرف فساد ہی فساد ہے۔

قانون کے ساتھ قوت

اس سے ظاہر ہے برادران! کہ صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں۔ اس قانون کے پیچھے قوت نافذہ کا ہونا بھی ازبس ناگزیر ہے۔ اگر قوت نافذہ کمزور ہو تو قانون کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اپنے معاشرہ کے برعکس، آپ خارجی کائنات پر غور کیجئے کہ وہاں فطری قوانین کس حسن و خوبی سے کار فرما ہیں فلک کی پہنائیوں میں تیرنے والے ان عظیم کروں کو دیکھئے کہ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں کس نظم و ضبط کے ساتھ مصروف سعی و عمل ہے۔ ماہرین افلاک کا کہنا ہے کہ یہ کہکشاں، جو ہمیں محض گرد مرمریں یا جوئے شیر نظر آتی ہے سیاروں اور ستاروں (ثوابت و سیار) کی ایک عظیم کائنات ہے جس میں ایک ایک کرہ، نہ صرف سورج بلکہ پورے نظام شمسی سے اس قدر بڑا ہے جیسے تل کے سامنے پہاڑ۔ یہ تمام محیرالعقول کارگہ اور اس کی یہ ہوش ربا مشینری روز اول سے آج تک، غیر مرئی اور نا محسوس باہمی کشش کے ذریعے، اس حدود نا آشنا فضا میں لاکھوں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے، مصروف حرکت ہے لیکن کیا مجال جو اس میں کبھی ذرا سا بھی ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔ اس کارگہ شیشہ گراں، کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کروڑ ہا کروڑ اجرام فلکی میں سے کسی ایک میں، ذرے کے برابر بھی کشش میں کمی، یا اس کی رفتار میں تیزی یا سستی واقع ہو جائے تو یہ سارے کا سارا نظام ایک لمحہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

آسمانوں سے نیچے اتر کر اپنی زمین کی طرف آیئے تو قانون خداوندی کی کارفرمائی اور نتیجہ خیزی نگہ بصیرت کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ایک ہی قطعہ زمین میں برابر برابر ببول اور آم کے بیج ڈال دیجئے۔ وہی مٹی ہے، وہی پانی، وہی ہوا ہے، وہی روشنی، وہی برودت ہے وہی حرارت، لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ببول کے تخم سے آم کا پیڑ اگ آیا ہوا اور آم کے درخت میں ببول کے کانٹے لگ گئے ہوں۔ آپ غور کیجئے برادران! کہ جس ہستی نے کائنات کے لئے ایسے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں وہ کس قدر صاحب اقتدار و جبروت ہے کہ ہر قانون اپنا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کئے جا رہا ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جب اسی خدا کے قوانین (جو وحی کی رو سے ملیں) انسانی دنیا میں بھی کار فرما ہو جائیں تو وہ کس طرح

اپنے صحیح صحیح نتائج بحسن و خوبی پیدا کرتے چلے جائیں گے ؟ اس حقیقت کے اظہار کے لئے سورہ والنجم میں وحی کے بیان کے بعد کہا کہ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (53/5) نبی کو اس وحی کا علم اس ہستی نے دیا ہے جو بڑی زبردست قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (51/56) ہے لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ جو معاشرہ اس قوانین کے مطابق چلے' اسے ان قوانین کے نتائج و ثمرات نصیب نہ ہوں۔ وہ ان نتائج سے ضرور بہرہ یاب ہو گا لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ (39/20) اللہ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہا کرتے ہیں۔

اب اور اگے چلئے

ہر شے کی ربوبیت

کائنات کی مشینری کا ہر پرزہ اس لئے مصروف سرگردانی ہے کہ ہر شے کی مضمر صلاحیتوں (Potentialities) کی پوری پوری نشو و نما (Development) ہو سکے۔ ابر و باد و مہ و خورشید' سب اسلئے مصروف کار ہیں کہ رائی کا ایک ننھا سا دانہ پودا بن کر سات سات سو دانے پیدا کرے۔ یہ اس دانے کی تقدیر یا (Destiny) ہے۔ یہ اس کی زندگی کی آخری منزل ہے۔ یہ اس کی مضمر صلاحیتوں کی تکمیل کا آخری نقطہ ہے۔ لہٰذا خدا کا کائناتی قانون اس حسن و خوبی سے اس لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر شے کی ربوبیت (پرورش نشو و نما) ہوتی چلی جائے۔ وہ اپنے نقطہ آخرین تک جا پہنچے۔ اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہو جائے لیکن اشیائے کائنات کی نشو و نما' قانون ارتقاء (Evolution) کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے' ہر آن' سلسلہ ارتقاء کی ایک نئی منزل (Stage) میں داخل ہوتی ہے۔ جہاں اس کی نشو و نما کے تقاضے' اس کی سابقہ منزل سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا کا قانون ربوبیت ایسا ہے کہ کوئی شے جس حالت میں ہو' وہ اس کے مطابق سامان نشو و نما بہم پہنچاتا

ہے **یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ**۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' اپنی نشو و نما کے لئے سب خدا (کی ربوبیت) کے محتاج ہیں۔ اور ان میں سے ہر چیز کی حالت یہ ہے کہ **کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ**(55/29) وہ ہر آن میں ایک نئے انداز کو لئے ہوتی ہے جس میں اس کی پرورش کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

بدلتے ہوئے تقاضے

یہ اس کے قانون ربوبیت کا کمال ہے کہ جو شے جس حالت میں ہو وہ اسی کے مطابق اس کی نشو و نما کا سامان عطا کر دیتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کی چھاتیوں میں دودھ کے چشمے رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ دودھ شروع میں بہت پتلا ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں' بچے کو زیادہ غذا (Nourishment) کی ضرورت ہوتی ہے دودھ میں غذا کے اجزا زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور پانی کی مقدار کم۔ اس کے ساتھ ہی بچے کے معدے میں ہضم کرنے کی قوت بھی بڑھتی جاتی ہے تاکہ وہ ثقیل دودھ کو جزو بدن بنا سکے۔ پھر' جب وہ خارجی غذا ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے دانت دے دیئے جاتے ہیں اور دودھ کی نہریں خشک ہو جاتی ہیں۔ **وقس علٰی ذالک**۔ ہر شے کو اس کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامان نشو و نما ملتا چلا جاتا ہے۔

جس طرح طبعی دنیا میں نشو و نما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اسی طرح انسانیت کی دنیا میں بھی نشو و ارتقاء کے تقاضوں میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اگر آج افریقہ کے حبشی اپنے جوہر انسانیت کی نشو و نما کے لئے نظام خداوندی کو اختیار کریں تو ان کی نشو و نما کے تقاضے اور ہوں گے اور اگر یورپ کی متمدن اقوام یہی کچھ چاہیں تو ان کے تقاضے ان سے مختلف ہوں گے۔ لہٰذا انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون بھی ایسا ہونا چاہئے جو انسانی ذات کے مستقل جوہروں کی پرورش اور بالیدگی'

زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کرتا چلا جائے۔ اس کے لئے فرمایا کہ وحی کا قانون جو اپنی نتیجہ خیزی میں حتمی اور یقینی واقع ہوا ہے اس خدا کا قانون ہے جو ذُوْمِرَّةٍ (53/6) ہے۔ یعنی زندگی کی تمام گزرگاہوں کا مالک۔ زمان اور مکان' دونوں اعتبار سے زندگی کے تمام بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر اور ان کی نشو و نما کا پورا پورا انتظام کرنے والا۔ رب العالمین۔

مقام محمدیؐ کا آغاز

یہاں تک برادران! گفتگو وحی یا اس خدا کے متعلق ہو رہی تھی جو وحی کو عطا کرتا ہے۔ اب اس گراں مایہ ہستی کا تذکرہ آتا ہے جس کا منور و مقدس سینہ وحی کا مہبط بنتا ہے۔ یعنی خود نبی کا تذکرہ۔ لہٰذا یہاں سے مقام نبوت یا مقام محمدیؐ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ذوق و انہماک کی ضرورت ہے۔ نہ صرف ذوق و انہماک کی بلکہ تعظیم و احترام کی بھی کہ

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

مقام نبوت کے متعلق ایک عظیم غلطی

آج کل ہم (مسلمانوں) میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حاصل کردہ وحی کو دوسروں تک پہنچا دے اور بس۔ یعنی جب وہ پیغام خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ ان کے خیال کے مطابق یوں سمجھئے کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ریڈیو کے سیٹ کی سی ہوتی ہے جو کچھ براڈ کاسٹنگ

ہاؤس سے براڈ کاسٹ (نشر) ہوتا ہے، یہ سیٹ اسے اخذ کر لیتا ہے۔ اور بعینہ اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ جب براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے کچھ نشر نہیں ہوتا تو ریڈیو محض ایک لکڑی کا ڈبہ رہ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ، بعض لوگوں کو ایک اور غلطی بھی لگتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وحی چونکہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے۔ یعنی وحی میں نبی کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم اسے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے نبی میں کسی ذاتی صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خدا نے اپنی وحی کسی نہ کسی کے ذریعے انسانوں تک پہنچانی ہوتی ہے اس لئے اس مقصد کے لئے جو انسان بھی اس کے سامنے آ جائے وہ اس کے ذریعے وحی کو انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہے وہ خیال جس کا مظہر وہ شعر ہے جو ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے جسے عام طور پر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یعنی

خدا کی دین کا موسےٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یعنی اللہ تعالیٰ کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آ چکا تھا کہ خدا کی وحی بنی اسرائیل تک پہنچا دی جاتی۔ اس وقت اتفاق سے حضرت موسےٰ آگ کی تلاش میں ادھر آ نکلے تو اللہ میاں نے تاج نبوت ان کے سر پر رکھ دیا۔ اگر اس وقت ان کی جگہ کوئی اور وہاں جا پہنچتا تو یہی پیمبری اسے مل جاتی!

نبی کی تربیت

یہ خیال بھی بنیادی طور پر غلط ہے اور نبوت سے یکسر بے خبری کا نتیجہ۔ اس کے ازالے کے لئے خود حضرت موسیٰؑ ہی کی مثال لیجئے (جن کے متعلق نہایت بے تکلفی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آگ لینے کو گئے اور پیغمبری مل گئی!) سنئے کہ اللہ

تعالیٰ ان کے منصب نبوت پر سرفراز ہونے کا سلسلہ میں کیا کہتے ہیں جب حضرت موسیٰؑ کو وحی سے نوازا گیا اور فرعون کے خلاف جس مہم پر جانے کے لئے ان سے کہا گیا تھا اس کے لئے ان کی طرف سے پیش کردہ متعدد درخواستیں منظور کر لی گئیں تو حضرت موسیٰؑ کا سر (فطری طور پر) احساس سپاس گذاری سے بدر گاہ رب العزت جھک گیا۔ اس وقت آپ سے کہا گیا کہ " اے موسیٰؑ! تم نے اسی کو ہمارا احسان سمجھا اور اس کے لئے جذبات تشکر تمہارے آبگینہ قلب سے ابھر آئے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ احسانات کب سے شروع ہے؟ اس کے لئے تمہیں بہت پیچھے جانا ہو گا۔ یہ سلسلہ اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب تم پیدا ہوئے تھے وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (20/37) جب ہم نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ تمہیں ایک صندوق میں لٹا کر دریا میں بہا دے۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور تمہارا صندوق فرعون کے محلات میں جا پہنچا۔ اس طرح ہم نے اس کا انتظام کر دیا کہ تمہاری پرورش فرعون کے محلات میں ہو۔ تمہیں بڑے ہو کر (نبی بن کر) فرعون سے ٹکر لینی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تم رموز سلطنت اور اسرار حکومت سے واقف ہوتے۔

لیکن تم ایک

محکوم قوم (بنی اسرائیل) کے فرد تھے اس لئے تمہارے لئے ان اسرار و رموز تک بار پانا ناممکن تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے یہ تدبیر کی کہ تمہاری پرورش و تربیت خود محلات شاہی میں ہو۔ تمہیں ساری عمر شاہزادگی یا شاہنشاہی کی زندگی بسر نہیں کرنی تھی۔ تمہاری پیدائش سے مقصود کچھ اور تھا۔ تمہیں ایک دن بنی اسرائیل کو لے کر وادی سینا کے جنگلوں' پہاڑوں اور بیابانوں میں بھی جانا تھا اور وہاں ان کی تربیت کرنی تھی۔ اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تم صحرائی اور بیابانی زندگی سے بھی واقف ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے ایسی تدبیر کی گئی کہ تم شاہی

محلات کو چھوڑ کر مدین کی طرف بھاگ نکلا۔ فَلَبِثۡتَ سِنِيۡنَ فِيۡۤ اَهۡلِ مَدۡيَنَ (20/40) سو تم کئی برس اہل مدین میں رہے۔

اس طرح جب تم ان تمام مختلف مراحل سے گذرے تو ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوۡسٰى (20/40) تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پر پورے اترے وَاصۡطَنَعۡتُكَ لِنَفۡسِىۡ (20/41) اس طرح ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے بہ کمال حسن و خوبی تیار کیا اور جب تم اس طرح اس مقصد بلند کے قابل ہو گئے تو تمہیں وحی عطا ہوئی۔ یہ نہیں کہ تم یونہی آگ لینے کو ادھر آ نکلے اور ہم نے نبوت کا تاج تمہارے سر پر رکھ دیا۔

فاستویٰ

اس سے ظاہر ہے کہ ایک ہونے والے نبی کو پہلے ہی دن سے منصب نبوت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے خود اس کا علم نہیں ہوتا۔ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ (42/52) اس لئے کہ نبی کے اپنے کسب و ہنر کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لیکن نبی کے سینے کو ایسی گراں بہا متاع کا امین بننے کے لئے خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اس مقصد عظیم کے لئے نبی اکرمؐ کی ذات اقدس میں کیا کیا خصوصیتیں پیدا ہوئی تھیں۔ سورہ والنجم کی اگلی آیات میں ان کا ذکر ہے۔ اس کے لئے قرآن نے سب سے پہلے ایک لفظ استعمال کیا ہے فَاسۡتَوٰى (53/6) دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ لیکن معنویت کے اعتبار سے یہ اس قدر جامع ہے کہ انسانی ذات کی معراج کبریٰ کی ساری تابانیاں اس کے اندر مرتکز ہو گئی ہیں۔ اس کے مفہوم کے لئے یوں سمجھئے جیسے دور حاضر کی اصطلاح میں کہتے ہیں (Balanced Personality) وہ ذات جس میں انسانیت کی مضمر صلاحیتیں مکمل طور پر نشو و نما پا کر، پورے پورے اعتدال اور حسن توازن و تناسب کے ساتھ جمع ہوں۔ جس میں انسانی قوتیں اور جوہر انتہائی اعتدال کے ساتھ

جلوہ فرما ہوں۔ برادران! آپ سوچئے کہ ارتقائے شرف انسانیت میں اس سے بڑا مقام اور کونسا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ پہلی خصوصیت کبریٰ جس سے مقام محمدیؐ کی ابتداء ہوتی ہے۔ یعنی حسن سیرت کی کمال زیبائی و رعنائی۔ مختلف صفات انسانیہ کا پورا پورا اعتدال۔ خدا نے خود اپنے متعلق جو اسماء الحسنیٰ کہا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی وہ ذات جس میں تمام صفات (اسماء) اپنی کمل صورت میں بایں انداز جمع ہوں کہ ان میں پورا پورا تناسب پایا جائے۔ تناسب (Proportion) کا اعتدال ہی در حقیقت حسن ہے۔ حسن عمل بھی وہی ہے جس میں صحیح صحیح تناسب و اعتدال ہو۔ صحیح اعمال وہ ہیں جن میں صفات خداوندی کی جھلک ہو۔ لیکن ان میں اعتدال کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا تمام صفات' کامل اعتدال کے ساتھ حسن کارانہ انداز سے خدا کی ذات میں جمع ہیں۔ اسے انہی صفات کے ساتھ پکارو۔ یعنی اپنی ذات میں انہی صفات کو ابھار کرو۔ لیکن اسی اعتدال و تناسب کے ساتھ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (7/180) اور جو لوگ اس کی صفات میں (افراط و تفریط سے) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ ان سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں اعتدال پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ یعنی جو لوگ کسی ایک صفت خداوندی میں بھی' اعتدال کا دامن چھوڑ کر افراط اختیار کر لیتے ہیں وہ صحیح راستے پر نہیں۔ یہاں " الحاد فی الاسماء " کہا ہے سورہ سجدہ میں الحاد فی الایات۔ یعنی آیات خداوندی میں بھی کسی ایک طرف نکل جانے کو باطل کی راہ کہا ہے۔ (41/40) مومن وہ ہیں جو صراط مستقیم پر چلتے ہیں۔ یعنی توازن بدوش راہ پر' جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔ یہی لوگ منعم علیہ ہیں۔ یعنی جنہیں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہیں۔ اسی درخشندہ فہرست کا سر عنوان' مقام محمدیؐ ہے۔ جسے قرآن نے فاستویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی صفات خداوندی کو (علیٰ حد بشریت) پورے پورے

اعتدال کے ساتھ لیے ہوئے۔

علم کی بلندی

یہ ہوا سیرت کا کمال۔ اب آگے بڑھئے ارشاد ہے وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (53/7) افق کے معنی ——— (Horizon) یا زمین کے آخری کنارے کے ہیں۔ اس میں وسعت کی انتہا آ جاتی ہے اور جب اس کے ساتھ اعلیٰ کا لفظ آ جائے تو اس میں وسعتیں اور بلندیاں دونوں شامل ہو جاتی ہیں۔ آپ سطح زمین پر کھڑے ہوں تو آپ کی افق (وسعت نگاہ) بہت قریب ہو گی۔ آپ کسی اونچی عمارت پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کی افق کا دائرہ وسیع ہو جائے گا اور جب آپ کسی بلند ترین (اعلیٰ) مقام پر کھڑے ہوں تو یہ وسعت اپنی انتہا تک پہنچ جائے گی۔ لہذا هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى سے مراد یہ ہے کہ نبی کا علم اپنی وسعتوں اور بلندیوں میں انتہا تک پہنچا ہوا جاتا ہے۔

نبی کے معنی

ہمارے ہاں عام طور پر نبی کے معنی " پیشین گوئیاں کرنے والا یا خبریں دینے والا " کئے جاتے ہیں۔ (یعنی اسے نباء سے مشتق مانا جاتا ہے) نبوت کا یہ تصور در حقیقت یہودیوں کے ہاں سے آیا ہے۔ ان کے ہاں ہیکل (معبد) میں ایک بلند منصب کا حامل نبی کہلاتا تھا جس کا کام لوگوں کو آنے والے واقعات کے متعلق خبریں دینا (یا ان کی قسمت کی تقدیر بتانا) تھا۔ چنانچہ یہودی لٹریچر میں جن نبیوں کے قصے درج ہیں' وہ بالعموم ہیکل کے انہی منصب داروں سے متعلق ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ (نبی) کا ترجمہ (Prophet) ہوا۔ یعنی——— (Prophecies) پیش گوئیاں کرنے والا۔ لیکن قرآن کی رو سے نبی کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ یہ لفظ نبوۃ سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ لہذا نبی کے معنی ہیں وہ جو بلند مقام

پر کھڑا ہو۔ **بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ** (81/23) ان معانی کی وضاحت خود نبی اکرمؐ نے عملاً" کر کے دکھا دی۔ جب آپ کو حکم ملا کہ خدا کا پیغام اپنے لوگوں تک پہنچائیں تو آپؐ مکہ سے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ گئے اور لوگوں کو (بالخصوص اپنے اہل خاندان کو) بلایا۔ جب وہ جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف ایک لشکر جرار ہے جو تم پر چڑھائی کرنے کے لئے بڑھے چلا آ رہا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسے ضرور سچ مانیں گے۔ آپ نے پوچھا کہ تم اسے سچ کیوں مانو گے؟ انہوں نے کہا کہ ایک تو اس لئے کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر برادران! ذرا اس ٹکڑے پر پھر غور کیجئے کہ انہوں نے کہا کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ نے دیکھا! کہ ایک بننے والے نبی کی زندگی، نبوت سے پہلے بھی کس قسم کی ہوتی ہے؟ اس قسم کی کہ وہ اپنی قوم میں صادق اور امین مشہور ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ایک پاکباز اور دیانتدار انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسی پاکباز اور دیانت دارانہ زندگی کہ وہ اسے اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے چنانچہ جب نبی اکرمؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو آپؐ کی قوم نے کہا کہ آپؐ کوئی معجزہ دکھایئے تاکہ ہم یقین کرلیں کہ آپؐ واقعی خدا کے رسول ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10/16) میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں، میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تم مجھے جانتے نہ ہو۔ میں نے اس دعویٰ سے قبل ساری عمر تم میں بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے کے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ اگر تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر صداقت اور دیانت سے گذاری ہو، کس طرح ممکن ہے کہ

یہ ایک ہی رات میں یوں بدل جائے کہ اتنے بڑے جھوٹ اور فریب پر اتر آئے؟ لہٰذا میری گذشتہ زندگی میرے دعوے کی صداقت پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

ہاں! تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کی بات کا اس لئے یقین کر لیں گے کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور دوسرے اس لئے کہ آپؐ اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑی کے اس طرف بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس طرف بھی' اور ہم اس جگہ ہیں جہاں سے ہم اس طرف دیکھ سکنے کے قابل نہیں۔

آپؐ نے فرمایا کہ یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے خدا نے علم کی اس بلندی پر فائز کیا ہے جہاں سے میں اس دنیا کو بھی دیکھ سکتا ہوں جہاں سے حقائق کائنات ابھرتے ہیں اور اس دنیا کو بھی جہاں یہ منطبق (Apply) ہوتے ہیں۔ اسے مقام نبوت یا وحی خداوندی کہتے ہیں۔

یہی ہے برادران عزیز! وہ اُفُقِ الْاَعْلٰی جس پر نبی فائز ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ اس دنیا کو بھی دیکھتا ہے جو دوسرے انسانوں کی نگاہوں' بلکہ قیاس و خیال و گمان و وہم تک سے اوجھل ہے اور اس دنیا کو بھی جہاں انسان بستے ہیں۔ وہ علم کی ان بلندیوں پر ہوتا ہے۔

فکر و عمل میں مطابقت

اب اگلی آیت کی طرف آیئے! آپ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز (مفکرین) کی زندگی کو دیکھئے۔ بالعموم آپ کو یہ نظر آئے گا کہ ان کے افکار (Thoughts) بہت بلند ہوں گے۔ وہ کائنات کے عظیم حقائق سے بحث کریں گے۔ لیکن ان حقائق کی جھلک ان کی اپنی سیرت و کردار میں بہت کم دکھائی دے گی یعنی ان کی فکر۔ ان کے ادراک (Intellect) کی بلندی' اور ان کی عملی زندگی میں بہت بُعد ہو گا۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ علم کے افق اعلیٰ پر فائز ہونے کے ساتھ عملاً" بھی حقائق

کائنات سے بہت قریب ہوتا ہے (ثُمَّ دَنَا) (53/8) ان حقائق میں اور اس کی اپنی زندگی میں قطعاً" بُعد نہیں ہوتا۔

حقائق کی گہرائیوں میں

زندگی کو ان حقائق سے ہم آہنگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حقائق کا صرف فکری اور نظری طور پر ہی ادراک نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے (فَتَدَلّٰی) (53/8) وہ ضمیر کائنات کے عمق (Depths) تک جا پہنچا ہے۔

جوڈ (Joad) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی انسان میں علم کی وسعت ہو تو وہ مفکر (یعنی فلاسفر) ہوتا ہے اور اگر اس میں جذبات کی گہرائی ہو تو وہ تخلیقی نابغہ (Creative Genius) ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس ذات میں علم کی بلندیاں' حقائق کی وسعتیں اور تخلیقی جذبات کی گہرائیاں اپنے انتہائی اعتدال کے ساتھ یکجا جمع ہوں' اسے نبی کہا جاتا ہے۔

نبی کا فریضہ

یہ ہے براوران! علم و جذبات و کردار کے اعتبار سے مقام محمدیؐ کی ایک جھلک جو قرآن کے ان درخشندہ موتیوں میں اس طرح جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس قدر عظیم علم (وحی) پانے کے بعد نبی کا فریضہ کیا قرار پاتا ہے ؟ اس کا منصب کیا ہوتا ہے ؟ یہیں سے یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ نبی محض (معاذ اللہ) ایک آلہ ابلاغ پیغام پہنچانے والا ریڈیو سیٹ نہیں ہوتا۔ اس کا مشن اس سے آگے کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

آپ میں سے اکثر احباب' علامہ اقبالؒ کے مجموعہ خطبات (Lectures) سے واقف ہوں گے۔ انہوں نے اپنے پانچویں لیکچر کا افتتاح اس طرح کیا ہے۔

محمدؐ عربی فلک افلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

یہ الفاظ ایک بہت صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہی) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعور نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ گاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت۔۔۔ نوع انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کی انفرادی تجربہ گاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحب وحی کے تجربے کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

(خطبات اقبال)

تصوف اور نبوت

میں اس وقت' برادران! ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ حقیقت کیا ہے اور جس چیز کو کشف والہام کہا جاتا ہے ان کی ماہیت کیا؟ ان امور کے متعلق میں اس سے پہلے متعدد مقالات پر لکھ چکا ہوں۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ مقام نبوت (فلک الافلاک کی بلندیوں) تک پہنچنا تو ایک طرف صوفی کا گذر اُن دوائر میں بھی نہیں ہو سکتا جن سے وحی کا نزول ہوتا ہے۔ صوفی کے تمام کمالات اس کے اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتے ہیں اس کے برعکس نبوت ایک یکسر وہبی عطیہ ہے جس میں نبی کے اپنے کسب و ہنر (تو ایک طرف) اختیار و ارادہ کو بھی دخل نہیں ہوتا۔ جس چیز کو تصوف کی دنیا میں روحانی ترقی سمجھا جاتا ہے وہ دراصل انسان کی بعض نفسیاتی قوتوں کی بیداری اور نشو و نما ہوتا ہے۔ یہ اس کی اپنی داخلی قوتیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس وحی' خارج سے انکشاف حقیقت کا نام ہے جسے نزول کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ صوفی اس مقام تک پہنچ کر جہاں سے نبی کو وحی ملتی ہے واپس آ سکتا ہے یا نہیں۔ جو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا' اس کی واپسی کا کیا ذکر؟ جس مقصد کے لئے میں نے اس اقتباس کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب نبی پر انکشاف حقیقت ہوتا ہے (یعنی اسے وحی ملتی ہے) تو اس سے مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان حقائق مستور کے پرکیف مناظر سے ذاتی طور پر لذت اندوز ہوتا رہے اور ان کی حیرت انگیز کیفیات میں اس قدر مستغرق ہو جائے کہ صوفیوں کی طرح اس کی بھی (معاذ اللہ) یہ حالت ہو جائے کہ۔

کاں راکہ خبر شد خبرش باز نہ آید

رسالت کا فریضہ

نبی کو وحی اس لئے نہیں ملتی۔ اسے وحی اس لئے ملتی ہے کہ وہ اسے لے کر انسانوں کی دنیا کی طرف آئے اور ظلم واستبداد کی ان تمام طاغوتی قوتوں کو جو عالم انسانیت میں فساد برپا کر رہی ہوں' راستہ سے ہٹا کر انسانی معاشرہ کو قوانین خداوندی کے خطوط پر متشکل کر دے۔ با لفاظ دیگر' وہ عالم انسانیت میں خدا کے پروگرام کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف (داستان حضرت موسیٰ میں) یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (20/41) ہم نے تجھے (اے موسیٰ۔ اس طرح) اپنی ذات کے لئے تیار کیا۔ اس میں لِنَفْسِي کا ٹکڑا قابل غور ہے۔ گویا خدا کا ایک پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے صاحب ضرب کلیم کو اس طرح (درجہ بدرجہ' منزل بہ منزل) تیار کیا۔ وہ پروگرام کیا تھا؟ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (20/43) تم دونوں (حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ) فرعون کی طرف جاؤ۔ اس لئے کہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ وہ حد سے نکل گیا ہے۔ یعنی ایک نبی کو وحی اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ مظلوم انسانیت کو مستبد اور سرکش قوتوں کے پنجہ آہنی سے چھڑا کر خدا کے قوانین کے تابع لے آئے۔ یہ نقطہ برادران! ذرا مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔

انسان اور کائنات میں فرق

آپ نظام کائنات پر غور کیجئے۔ وہاں ہر شے خود بخود قوانین خداوندی کے مطابق مصروف کار ہے جس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اس کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرداں و جنباں ہے لیکن انسان کو چونکہ صاحب ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے اسے اختیار حاصل ہے کہ یہ چاہے تو قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کر کے دوسری روش پر چل نکلے' جب

مستبد قوتیں قانون خداوندی کے راستے کو چھوڑ کر' اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق نظام قائم کر لیتی ہیں تو زبردست انسان ان کے پاؤں تلے بری طرح روندے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا قانون مکافات' ان سرکش قوتوں کے اعمال کے نتائج مرتب کر رہا ہوتا ہے اور ان نتائج کو ایک دن ان کے سامنے بھی آنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کچھ خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر خدا کے اس قانون مکافات کے ساتھ انسان کا ہاتھ بھی لگ جائے تو یہی نتائج انسانوں کے ماہ و سال کے حساب ۔ مرتب ہو کر سامنے آ جاتے ہیں اور جن سرکش قوموں نے صدیوں کے بعد جا کر تباہ ہونا تھا وہ دنوں میں سرنگوں ہو کر وجہ نجات انسانیت بن جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب انسان خدا کا رفیق بن جائے تو پھر خدا کے پروگرام (مشیت) کی تکمیل انسانی حساب و شمار کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقامات پر بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ سورہ سجدہ میں ہے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ قانون خداوندی کے مطابق تدبیر امور کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ہر اسکیم کو اس کے پست ترین نقطہ سے شروع کرتا ہے اور اسے اپنے نقطہ آخرین تک پہنچانا ہوتا ہے وہ سکیم اپنے نقطہ آغاز سے بلند ہونا شروع ہوتی ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (32/5) اور اس طرح ا۔ اٹھتی جاتی ہے (خدا کی طرف بلند ہوتی جاتی ہے) ایک ارتقائی مرحلہ میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار سے ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اسی کو سورہ فاطر میں یوں کہا گیا ہے کہ۔ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ خوشگوار نظریہ حیات اس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ اس کا یہ بلند ہونا' خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) اس کے آگے ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (35/10) اور عمل صالح اسے رفعت عطا کر دیتا ہے۔ یعنی ویسے تو وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتا ہی ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسان کے

اعمال صالح بھی شامل ہو جائیں یہ اس کی رفتار یا ترقی Speed or Progress کو تیز تر (Accelerate) کر دیتے ہیں۔ انسان کی رفاقت کے بغیر وہ صرف اپنے زور دروں سے اوپر چڑھتا تھا۔ اس کی رفاقت اسے خارجی قوت کا سہارا دے کر' جلد بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ خدا اور انسان کا یہ حسین تعلق (یعنی رشتہ رفاقت) وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری سانس میں ان الفاظ میں اشارہ فرمایا کہ **بَلِ الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى** خدا رفیق اعلیٰ ہے۔ یعنی اس پروگرام کی تکمیل میں انسان رفیق ادنیٰ ہوتا ہے اور خدا رفیق اعلیٰ لیکن تعلق ان کا رفاقت کا ہی ہوتا ہے۔

قاب قوسین

اس پس منظر کی روشنی میں آگے بڑھئے' عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب دو دوست آپس میں گہری رفاقت کا معاہدہ کرتے تو وہ دونوں اپنی اپنی کمانیں ملاتے اس طرح کہ دونوں کا چلہ ایک ہو جاتا۔ یعنی وہ کمانیں تو دو ہوتیں۔ لیکن ان کا چلہ ایک ہوتا۔ اس چلہ میں تیر رکھتے۔ ان میں سے ایک کمان کو کھینچتا اور دوسرا چلہ کو اور اس طرح دونوں مل کر تیر چلاتے۔ اس محکم معاہدہ رفاقت کو وہ قاب قوسین (دو کمانوں کے ایک چلہ) سے تعبیر کرتے۔

قرآن نے کہا ہے کہ جب نبی اکرمؐ کی ذات اقدس میں شرف انسانیت کے مختلف عناصر یک جا جمع ہو کر اعتدال تک پہنچ گئے اور علم و حقائق کی دنیا میں آپ کو انتہائی بلندیاں وسعتیں اور گہرائیاں حاصل ہو گئیں تو اس کے بعد **فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى** (53/9) آپ کا خدا کے ساتھ انتہائی رفاقت کا تعلق قائم ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ رسول اللہؐ نے خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کا پختہ عہد دے دیا اس عہد و پیمان کے بعد وہ انسانوں کی طرف تشریف لائے۔ حالی کا سادہ اور حسین الفاظ میں' یہ داعی انقلاب' تاج نبوت سے سرفرازی کے بعد۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے کہ نبوت اس منصب کو کہیں گے جس کی رو سے نبی کو وحی ملتی ہے اور رسالت وہ منصب ہے جس کی رو سے وہ وحی کی روشنی میں انسانی معاشرہ میں آسمانی انقلاب پیدا کرتا اور اس طرح عملاً" وحی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں وہ قطعاً" بخل نہیں برتتا وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (81/24) اس اعتبار سے نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہہ کر پکارا ہے اور کہیں رسول کہہ کر، یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اسے کہتے ہیں جو صاحب کتاب نہ ہو اور رسول اسے جسے کتاب ملی ہو۔ قرآن سے یکسر لا علمی کی دلیل ہے۔ قرآن کی رو سے ہر نبی یعنی ہر رسول کو کتاب ملتی تھی۔ (دیکھئے 2/213، 57/25)

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ ایک نبی، وحی کی جگمگاتی قندیل کو ہاتھ میں لئے، دنیائے انسانیت کی طرف آتا ہے تاکہ انسانی معاشرہ کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کر کے، خدا کے پروگرام کی تکمیل کرے۔ اور جس طرح اس کی بادشاہت آسمانوں (خارجی کائنات) میں ہے اسی طرح زمین پر بھی اس کی حکومت قائم ہو جائے۔ اس طرح رسول اور اس کے ساتھی خدا کے انصار اور رفیق بن جاتے ہیں۔ اب جو کام ان کے ہاتھوں سے سر زد ہوتے ہیں۔ انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ (مثلاً") جنگ بدر میں جو تلواریں محمدؐ رسول اللہ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں سے اٹھیں اور جو تیر ان کی کمانوں سے نکلے ان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وہ کچھ خود ہمیں نے کیا تھا۔ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (8/17) تم نے انہیں قتل نہیں کیا، اللہ نے

قتل کیا ہے۔ تم نے ان پر تیر اندازی نہیں کی۔ خود اللہ نے کی ہے۔ برادران عزیز ! غور کیجئے کہ **قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى** کی کیسی دلنشین پیرا یہ میں تشریح کی گئی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ۔

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
لیکن کشود آں زکمانِ محمدؐ است

مقام رسالت کی اس سے بہتر انداز میں تصویر کشی شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

مقام عبدیت

علم و عمل کے ان تمام بلند ترین گوشوں کو سامنے لانے کے بعد، قرآن نے کہا ہے **فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى** (53/10) جب یہ عبد (نبی اکرمؐ) اس مقام تک پہنچ گیا تو پھر خدا نے اسے وحی کی خلعت سے سرفراز کیا! یہ مرتبہ بلند ہر کسی کو نہیں مل جایا کرتا۔ اتنی عظیم خصوصیات کا حامل ہوتا ہے وہ سینہ جسے وحی کا **مہبط** بننا ہوتا ہے۔ آپ نے غور کیا برادران! کہ قرآن نے حضورؐ کے لئے عبدہ کا لفظ اس مقام پر جا کر استعمال کیا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ مقام عبدیت کیا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جس کے تصور سے نگاہوں میں چمک، ذہن میں جلا اور قلب میں نور پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر۔ کتنا بلند ہے مقام عبدیت۔ آپ دیکھئے گا کہ قرآن نے جہاں نزول وحی کا ذکر کیا ہے وہاں عام طور پر عبد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ** (18/1) **تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ** (25/1) **هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ** (57/9) اسی لئے قرآن نے ہر رسول کو عبد کہا ہے۔

دل کی تصدیق

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ ایک شخص خواب میں کچھ محیرالعقول باتیں دیکھتا ہے' جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خواب میں دیکھے ہوئے مناظر پر خود ہی ہنس دیتا ہے اس لئے کہ اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ ایسی باتیں کبھی فی الواقعہ صحیح نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی جن حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے' یعنی جو علم اسے وحی کی بناء پر حاصل ہوتا ہے وہ خواب کا سا علم نہیں ہوتا کہ آنکھیں دیکھیں اور دل اس کی تردید کرے اس کا دیکھنا علم و یقین کا دیکھنا ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کا دل اس کی کبھی تکذیب نہیں کرتا۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى (53/11)

یہی وجہ ہے کہ نبی اپنی وحی پر سب سے پہلے خود ایمان لاتا ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ (2/285) جو کچھ اس کے رب کی طرف سے اس پر اتارا جاتا ہے رسول (سب سے پہلے) خود اس پر ایمان لاتا ہے اور پھر باقی مومنین۔اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6/164) میں سب سے پہلے اس وحی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

قرآن نے اس پر ایمان کے لئے دل کی شہادت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے سورہ منافقین میں ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورت کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (اے رسول) جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں تو یقیناً" اللہ کا رسول ہے اس کے بعد ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ اور اللہ کو اس کا علم ہے کہ تو یقیناً" اس کا رسول ہے اس سے ظاہر ہے کہ منافقین ایسی بات کہتے ہیں جو امر واقعہ ہے اور جس کی شہادت خود اللہ دے رہا ہے اس لئے منافقین کے سچا ہونے میں بظاہر کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن

اس کے آگے ہے کہ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (63/1)اور اللہ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً" جھوٹے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے یہاں کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے اور کیسے دلنشین پیرایہ میں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ منافقین زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ تو بالکل سچی حقیقت ہے لیکن چونکہ ان کا دل اس کی شہادت نہیں دیتا اس لئے یہ جھوٹے ہیں۔ اس سے قرآن نے کذب کی ایک واضح اور محکم تعریف (Definition) بیان کر دی ہے یعنی جب تک کسی کا قلب اور زبان ہم آہنگ نہ ہو' اسے سچا نہیں کہہ سکتے۔ کذب وہ ہے جس میں قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو۔ ایک شخص زبان سے ایک ایسی بات کہتا ہے جو بالکل سچی ہے۔ لیکن اگر اس کا دل اس کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ کاذب ہے۔ صادق نہیں ہے اقبال کے الفاظ میں۔

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
لغت غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

ایمان یہ ہے کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (53/11) جو کچھ آنکھیں دیکھیں دل اس کی تکذیب نہ کرے۔ نبی اپنی وحی پر اسی طرح ایمان لاتا ہے۔ وہ حقائق کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا دل ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن ضمناً" ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے جو نبی کی اس وحی کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم ہمیشہ کہتے یہ ہو کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ لیکن عملاً" تمہاری حالت یہ ہے کہ تم رسول سے اس بات پر جھگڑتے ہو جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان کرتا ہے أَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى کتنی بڑی ہے تمہاری بھول اور کس قدر غیر معقول ہے تمہاری یہ مخالفت ؟ اس ضمنی گوشے کے بعد قرآن پھر اسی موضوع پر آجاتا ہے اور اگلی آیت میں ایک اور عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔

وحی اور خواب

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا حتمی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اسی چیز کو اس نے باندازِ دگر بیان کیا ہے۔ خواب کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ آپ کسی خواب کو ان کی تفاصیل جزئیات۔ ربط اور تسلسل کے ساتھ کبھی دوبارہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسے خواب مت سمجھو۔ اس لئے کہ **وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی** (53/12) اس نے اسے باردگر بھی دیکھا ہے اور فی الحقیقت (**لقد راہ**) دیکھا ہے۔ اس لئے اس کا یہ دیکھنا خواب نہیں۔ جو لوگ وحی کو خواب پر محمول کرتے ہیں یا خوابوں کو از قبیل وحی تصور کرتے ہیں انہیں دیکھنا چاہئے کہ یہ ان کی کتنی بڑی غلطی ہے۔ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا یقینی مشاہدہ ہوتا ہے اور بار بار ہوتا ہے۔ اس کے بعد قرآن وحی کے ایک اور بنیادی گوشے کو سامنے لاتا ہے۔ ایک طرف جذبات پرست ہیں جو خوابوں کو بھی از قبیل وحی قرار دیتے ہیں دوسری طرف عام مفکرین (فلاسفرز) ہیں جن کا خیال ہے کہ وحی' انسانی فکر ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ برگسان نے وجدان (Intuition) کے متعلق کہا ہے کہ وہ فکر کی بلند سطح (Higher Form of Intellect) ہے چنانچہ بعض لوگ وجدان کو وحی پر محمول کر لیتے ہیں۔ مغربی مفکرین کا رجحان اسی طرف ہے' قرآن نے جہاں اس تصور کی تردید کی ہے کہ خواب بھی وحی ہوتے ہیں وہیں واضح الفاظ میں اس کا بھی اعلان کر دیا کہ وحی فکر انسانی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں۔ وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقل انسانی کے لئے حیرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ **عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی** (53/14) نبی نے ان حقائق کو سدرۃ المنتہی کے قریب دیکھا۔ عربوں میں **الساور** اس شخص کو کہتے ہیں جو شدت گرمی کی وجہ سے متحیر ہو جائے۔ **سَدِرَبَصَرُہٗ سِدْرًا** کے معنی ہیں گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کی

نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں۔ اس لئے نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں
عقل انسان کے لئے سوائے تحیر کی فراوانیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا انسانی عقل وہاں
ششدر و حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس مقام اور
اس کی کیفیات کا مشاہدہ یا اندازہ کر سکے۔

لیکن اگر عقل انسانی مقام وحی کی کنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی تو اس کے
یہ معنی نہیں کہ عقل وحی کے حقائق سے مستفید بھی نہیں ہو سکتی۔ وحی کی تعلیم
انسان کی سمجھ میں آسکتی ہے اس لئے قرآن نے بار بار فکر و تدبر اور عقل و شعور
سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اس تعلیم کا سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر
عمل کیا جائے اور اس پر عمل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس دنیا میں بھی جنتی
معاشرہ قائم ہو سکے اور اس کے بعد کی زندگی بھی جنت کی ہو۔ لہذا وہی عقل جو مقام
نبوت کی کنہ و حقیقت سمجھنے سے یکسر قاصر ہے' وہ اگر وحی کے پیغام کی اتباع کرے
تو جنت کی خوشگواریاں اس کے حصے میں آ سکتی ہیں اس لئے کہ مقام وحی اگر
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ہے تو عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (53/15) جنت بھی
اسی کے پاس ہی ہے جو شخص عقل کی رو سے مقام نبوت کو اپنے حیطہ ادراک میں
لانے کی سعی لا حاصل کرتا ہے اس کے حصے میں حیرت کی فراوانیوں کے سوا کچھ
نہیں ہوتا۔ لیکن جو شخص عقل و بصیرت کی رو سے وحی کے پیغام کو عملی نظام میں
متشکل کرتا ہے وہ اپنے آپ اور اپنے ساتھ باقی انسانیت کو جنت کی آغوش میں لے
آتا ہے۔ جہاں وہ اضطراب باقی نہیں رہتا جو عقل کی نارسائی کی وجہ سے قدم قدم
پر اس کے لئے وجہ خلش بنتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل جنت کے متعلق کہا ہے کہ
وہ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ○ (56/28) ہوں گے یعنی ان " بیریوں " کے نیچے
جن کا سایہ آرام دہ اور پھل خوشگوار ہوں گے لیکن جن میں کانٹے نہیں ہوں گے۔
ایسی حیرت جس میں شکوک کی خلش نہ ہو۔ بہرحال وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقل

انسانی بار ہی نہیں پا سکتی۔ جہاں عام انسان کی آنکھ کے لئے ہر طرف تحیر ہی تحیر ہوتا ہے۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب ان تحیر کی وادیوں پر ہر طرف سے علم الٰہی چھایا ہوا ہوتا ہے اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (53/16) تو اس کی آنکھ اس مقام پر بھی ذرا اودھر اودھر نہیں ہوتی مَا زَاغَ الْبَصَرُ (53/17) وہ ذرا نہیں بھٹکتی۔ غور کیجئے کہ عقل انسانی اور نگہ نبویؐ میں کتنا عظیم فرق ہوتا ہے یہ فرق درجہ (Degree) یا کمیت کا (Quantitative) نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں کہ ایک ذرا نیچے ہے اور دوسری ذرا اوپر۔ یہ فرق اصل بنیاد کا فرق ہوتا ہے کمیت کی بجائے کیفیت کا (Qualitative) ہوتا ہے۔ عقل انسانی' کسب و ہنر سے اس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس مقام سے ملے ہوئے پیغامات سے نفع یاب ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہے نگہ نبوت کا تقابل عقل انسانی سے یعنی عقل انسانی کے مقابلہ میں نبوت حدود فراموش ہوتی ہے

علم نبوی کی حد

لیکن جب اس کا مقابلہ علم خداوندی سے کیا جائے تو علم نبوی لا محدود اور لاانتہا نہیں ہوتا نبوت کی آنکھ اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جو اس کے لئے علم خداوندی نے مقرر کر رکھی ہو۔ اس لئے مَا زَاغَ الْبَصَرُ کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وَ مَا طَغٰى (53/17) وہ نگاہ جس تحیر کی ان فراوانیوں کے باوجود ذرا اپنے مقام سے اودھر اودھر نہیں ہوئی۔ وہاں وہ اس حد سے بھی تجاوز نہیں کر سکی جو اس کے لئے متعین تھی۔ اس لئے کہ نبی کا علم (وحی) کتنا ہی بلند اور وسیع کیوں نہ ہو۔ وہ بہرحال' خدا کا عطا کردہ اور علم خداوندی کے مقابلہ میں محدود ہوتا ہے۔ انسانوں کے مقابلے میں وحی کا مقام وہ ہے جہاں انسانی علم و عقل کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں لاانتہا نہیں۔

آیات کبریٰ

مقام نبوت کے متعلق ان تصریحات کے بعد' قرآن چند لفظوں میں بتاتا ہے کہ نبی اس مقام بلند پر پہنچ کر دیکھتا کیا ہے؟ اس مقام پر قرآن نے وحی کی تفاصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ **لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى** (53/18) اس نے اس مقام پر اپنے نشو و نما دینے والے کی آیات کبریٰ (عظیم نشانیوں) کو دیکھا۔ ان آیات کبریٰ سے مراد کیا ہے؟ اس کے لئے پھر داستان حضرت موسیٰ کی طرف آیئے۔ جب حضرت موسیٰ کو طور کی چوٹیوں پر وحی سے نوازا گیا تو ان سے کہا گیا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ **لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى** (20/23) تاکہ ہم تجھے اپنی آیات کبریٰ دکھائیں اس کے بعد ہے **اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى** (20/24) فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے' وہ حد سے تجاوز کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی پانے کے بعد' نبی کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ سرکش قوتوں کو ان کے ظلم و استبداد سے روکے اور مظلوم انسانیت کو ان کے دندان حرص و آز سے چھڑائے۔ وہ اس مقصد عظیم کو لے کر آتا ہے اور طاغوتی قوتوں کو' قیامت خیز تصادمات کے بعد' شکست دے کر قوانین خداوندی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل جدید کرتا ہے ان سرکش و مستبد قوتوں کی اس طرح سے شکست اور ان کے غاصب و ظالم نظام کی جگہ' خدا کے نظام ربوبیت عالمینی کا قیام' وہ آیات کبریٰ ہیں۔ جن کا مشاہدہ نبی کو کرایا جاتا ہے۔

یہ ہے برادران عزیز! قرآن کی روشنی میں نبی کا مقام اور یہ ہے وہ فریضہ عظیم جس کی ادائیگی کے لئے اسے اس منصب جلیلہ پر فائق کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا۔ کہ نبی کا کام خدا سے وحی پا کر اسے انسانوں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں' نظام خداوندی کا قیام بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد

بہت بلند اور یہ فریضہ بڑا اہم ہوتا ہے۔

نبوت، نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی لہٰذا حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔ لیکن اس وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام اور اس کے قیام کے بعد اس کا تسلسل و استحکام وہ فرائض ہیں جو حضورؐ کی تشریف براری کے بعد، امت کے سپرد ہوئے۔ حضورؐ کے بعد امت نے کچھ وقت تک اس فریضہ کو سرانجام دیا لیکن اس کے بعد بدقسمتی سے یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا چڑی اور نظامِ خداوندی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب امت کا کام یہ ہے کہ اتباعِ نبوی میں پھر سے اسی نظام کو قائم کرے تاکہ خدا کا دین متمکن ہو جائے اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پالے۔

یاد رکھئے برادران! انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے اس کی نجات و سعادت کی صرف ایک ہی راہ ہے یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدیؐ (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے اور جس کی طرف پیامِ محمدیؐ (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

پرویز

●●●●